© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

مشکلاتِ قرآن

محکم و متشابہ آیات

تفسیر و تعبیر کے لحاظ سے محکمات و متشابہات کا مسئلہ قرآن حکیم کے نہایت ہی اہم اور مشکل مسائل میں سے ہے، جس کو جانے بغیر کسی آیت کے فہم و ادراک میں وثوق سے کچھ کہنا دشوار ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے جیساکہ قرآن حکیم نے اشارہ کیا ہے کہ بسا اوقات اس فرق کو نظر انداز کر دینے سے گمراہی کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے الٰہیات کے دقیق مسائل سے لے کر محسوسات کے آسان مسائل تک، ہر چیز کی وضاحت کی ہے اور بیسیوں انداز سے ایک ایک مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ اس لیے طبعی طور پر ایسا بھی ہوا ہے کہ کہیں کہیں مسئلہ زیر بحث چونکہ اپنے سیاق سے ہٹ کر بیان ہوا اس لیے اس میں ایک گونہ اشکال پیدا ہو گیا۔ یہ بھی ہوا کہ جہاں تفصیل کا تقاضا تھا وہاں تو مسئلہ مفصل بیان ہوا، لیکن جہاں مضمون کوئی اور بیان کرنا مقصود تھا، اور یہ ضمناً بحث کی زد میں آ گیا، یہاں اس میں قدرے اہمال رہ گیا۔ اسی طرح کہیں لفظ کی ندرت نے اشکال پیدا کیا اور کہیں معنی کی گہرائی نے پیچیدگی کو جنم دیا۔ کہیں پیرایۂ بیان سے ٹھوکر لگی اور ہم مجاز سے حقیقت سمجھ بیٹھے، کہیں تمثیل کو اصل حقیقت قرار دیا اور اس طرح مسئلہ الجھ کر رہ گیا۔

ان حالات میں ایک دیانت دار مفسر کے فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ وہ جو مسئلہ جہاں صاف صاف اور واضح شکل میں بیان ہوا ہے اس سے استفادہ کرے اور مجمل، مشکل اور متشابہ مقام کو اس کی روشنی میں حل کرے۔ نہ یہ کہ مجازات اور مجملات و متشابہات پر قیاس کرکے واضح اور محکم آیات کی تفسیر میں گڑبڑ پیدا کرے۔

محکمات و متشابہات کی اس تقسیم کا تعلق اصطلاح کی رُو سے اگرچہ قرآن حکیم ہی سے ہے، تاہم یہ اشکال صرف قرآن ہی کا اشکال نہیں۔ ہر اس عظیم کتاب کا اشکال ہے جس میں مضامین کی گونا گونی کا یہ عالم ہو کہ ایک ایک مضمون کو بیسیوں انداز سے بیان کیا گیا ہو۔ ہر عظیم کتاب میں مضامین کہیں واضح ہوں گے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کہیں غموض و اشکال لیے ہوئے ہے۔ کہیں لب و لہجہ صاف اور عام فہم ہوگا، کہیں دقیق اور کہیں مشکل۔ کہیں بات مجاز کے پردے میں چھپا کر بیان کی جائے گی اور کہیں صاف صاف اور غیر مبہم۔ یہ پیرایہ بیان کا اختلاف ہے اس لیے اس پر نہ کسی معذرت خواہی کی ضرورت ہے بلکہ علامہ رازی کی طرح اس کی حکمتوں کو بیان بیان کرنے کی ضرورت۔

قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ از راہِ شفقت اس نے خود ہی محکمات و متشابہات کے اس فرق کو بیان کر دیا:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ط (آل عمران، ۷)

وہی تو ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور بعض متشابہات۔

حالانکہ اگر اس کی وضاحت نہ بھی کی جاتی، تب بھی اس کو تفسیر و تعبیر کے نقطۂ نگاہ سے اہم سمجھ کر بیان کیا جاتا اور بتایا جاتا کہ قرآن حکیم سے استدلال و استنباط کے مرحلے میں ان مقامات کو اوّلیت حاصل ہے۔ جہاں کسی مسئلے کو خصوصیت سے موضوع بحث قرار دیا گیا ہے اور وہ مقامات ثانوی اہمیت کے سزاوار ہیں، جہاں کسی مسئلے کا تذکرہ بر سبیل تذکرہ یا مثال و تجوز کے اعتبار سے ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ سلف کو جزائے خیر عطا کرے۔ انھوں نے جہاں اسلام کے متعلق دوسرے مسائل پر تحقیق و تفحص سے کام لیا ہے وہاں اس مسئلے کو بھی تشنہ نہیں رہنے دیا۔ محکمات کون آیات ہیں اور متشابہات کے ضمن میں کس نوع کی آیات کا شمار ہوتا ہے؟ اس کو علما نے تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) محکم وہ آیات ہیں جو دلالت و معنی کے اعتبار سے واضح اور نمایاں ہوں اور ان میں نسخ کا احتمال نہ ہو۔ اور متشابہ آیات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے معانی کو انسان نہ پا سکے، جیسے قیامت کیا ہے، حروفِ مقطعات کا اطلاق کن معانی پر ہوتا ہے، وغیرہ۔ علامہ آلوسی نے اس رائے کو احناف کے اکابر علما کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۲) محکم ان آیات کو کہتے ہیں، جن کے معنی یا تو واضح ہوں اور یا تاویل و تعبیر کے ذریعے معلوم کیے جا سکتے ہوں۔ اور متشابہ وہ آیات ہیں جن کے معنی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو معلوم نہ ہوں۔ جیسے قیامِ ساعت، خروجِ دابہ، اور حروفِ مقطعات۔

(۳) محکم ان آیات سے تعبیر ہے جو تاویل و معنی کے ایک ہی پہلو کی متحمل ہوں، اور متشابہ اس کو کہیں گے جس سے کئی معنی مراد لیے جا سکیں۔ یہ ابن عباس سے روایت ہے۔ اصولیوں کی اکثریت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) محکم سے مراد وہ آیات ہیں جو معنی کے اعتبار سے مستقل بالذات ہوں اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جو معانی کی تعیین کے لیے تاویل و تشریح کی مقتضی ہوں۔ اس رائے کو امام احمد بن حنبل نے اختیار کیا ہے۔

(۵) محکم کا اطلاق ان آیات پر ہوگا جو نظم و ترتیب کے اعتبار سے مستحکم اور سدید ہوں اور ان میں کوئی تناقض نہ پایا جائے، اور متشابہ ان آیات کو کہیں گے جن کی لغت کی رو سے تسلی بخش تشریح نہ ہو سکے اور یہ کہ کچھ قرائن و اشارات اس پر روشنی ڈالیں۔ یہ امام الحرمین کی رائے ہے۔

(۶) محکم سے مقصود وہ آیات ہیں جو معنی و تفسیر کے نقطۂ نگاہ سے واضح ہوں اور ان میں کوئی اشکال نہ پایا جائے اور متشابہ سے مراد ایسی آیات ہیں جن میں مشترک المعنی الفاظ کا استعمال ہوا ہو۔ یا اس میں ایسے الفاظ آئے ہوں جن سے اللہ تعالیٰ کی صفات کے سمجھنے میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہو۔ یہ علامہ طیبی کا قول ہے۔

(۷) محکم وہ آیات ہیں جن میں معنی دلالتِ راجحہ کا نتیجہ ہوں، جیسے مثلاً نصِ صریح ہے۔ اور متشابہ وہ آیات ہیں جن میں معنی کا تعین غیر واضح اساس پر ہو، جیسے مجمل، موؤل اور مشکل۔ یہ امام رازی کا موقف ہے۔

جہاں تک متشابہ آیات کے صحیح صحیح تجزیہ کا تعلق ہے، علامہ راغب اصفہانی کی رائے ہمیں بڑی حد تک جامع نظر آتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ متشابہ کی تین قسمیں ہیں۔ یا تو تشابہ لفظ کی غرابت کی وجہ سے ابھرتا ہے یا جہتِ معنی اس کا موجب ہوتا ہے۔ اور یا پھر لفظ و معنی دونوں کی وجہ سے تشابہ پیدا ہوتا ہے۔

جو تشابہ لفظ کی غرابت سے ابھرتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں، مفرد اور مرکب۔ مفرد جیسے ۔ اَبًّا (عبس: ۳۱) و یزفون (الصّٰفّٰت: ۹۴)۔ یہ دونوں تعلقِ غرابت لیے ہوئے ہیں۔

مفرد لفظ میں تشابہ کی ایک وجہ کسی لفظ کا مشترک المعنی ہونا بھی ہے۔ جیسے ید (آل عمران: ۷۳)، یمین (زمر ۶۷) وغیرہ۔ کہ ان کا استعمال انسانی اعضاء و جوارح کے معنی میں بھی ہوتا ہے اور صفاتِ الٰہیہ کے معنی میں بھی۔

لفظ مرکب میں تشابہ تین وجہ سے پیدا ہوتا ہے:

(۱) اختصار کی وجہ سے ۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ (النساء: ۳)

کہ اس آیت میں ازراہِ اختصار اس پس منظر کو تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا جس میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی، اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید اس اجازت کا تعلق یتامیٰ کے ساتھ مشروط ہے، حالانکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ اجازت مشروط نہیں عام ہے۔

(۲) بسا اوقات تفصیل سے بھی معنی میں تشابہ پیدا ہو سکتا ہے۔ جیسے لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (شوریٰ: ۱۱)۔ اس میں حرف کاف زائد ہے اور تفصیل کے لیے ہے لیکن اس سے بجائے وضاحت کے اور غموض پیدا ہو جاتا ہے۔

وہ تشابہ جو جہتِ معنی سے تعلق رکھتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور احوال قیامت وغیرہ داخل ہیں۔

ہم ان تمام اقوال سے کلیتہً اتفاق رائے نہیں رکھتے۔ ہمارے نزدیک ہر وہ آیت متشابہ ہے جو اجمال یا کسی نہ کسی طرح کا معنوی اشکال اور غموض لیے ہوئے ہے۔ اور ہر وہ آیت محکم ہے جو معنی کے اعتبار سے واضح اور استوار ہے۔ غرض صرف یہ بیان کرنا ہے کہ محکم و متشابہ آیات کا یہ اشکال جو خود قرآن حکیم نے بیان کیا ہے، موجود ہے اور ہمارے ہاں علما نے نہ صرف اس کی اہمیت کو محسوس کیا ہے بلکہ ان مقامات کی نشاندہی بھی کی ہے، جہاں جہاں یہ اشکال پایا جاتا ہے۔

اس اشکال اور اس کے حل کو بیان کرکے قرآنِ حکیم نے مسلمانوں پر دراصل بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جہاں تک عقائد و افکار کا تعلق ہے اس کے بارے میں استدلال و استنباط کا انداز یہ ہونا چاہیے کہ ان کی اساس موضوع و تفصیل پر ہو، اجمال، غموض اور پیچیدگی پر نہ ہو۔ کیونکہ اس صورت میں قلب و ذہن میں گمراہی، کج روی اور ٹیڑھ کے ابھر آنے کا اندیشہ ہے جو انسان کو صحیح نتائج تک پہنچنے نہیں دیتی۔ قرآن حکیم نے کوئی مسئلہ تشنہ نہیں چھوڑا۔ اس نے ہر اس بات کو وضاحت سے بیان کیا ہے جو ضروری اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ خصوصیت سے جہاں تک توحید اور صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے قرآن حکیم نے اس باب میں ایک واضح اور دو ٹوک مسلک اختیار کیا ہے جو تشبیہ اور تنزیہہ کے ضمن میں ایک متوازن مسلک ہے۔ اختلاف نے شدت اس وقت اختیار کی جب مشبہہ اور حکما و متکلمین نے استدلال کی بنیاد چند آیات پر رکھی اور یہ نہ دیکھا کہ بحیثیت مجموعی وہ آیاتِ محکمات کون سی ہیں جن سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔

محکمات و متشابہات کے سلسلے میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ مضامین کے اعتبار سے یہ تقسیم اگرچہ بجا اور برحق ہے مگر متشابہات کا اطلاق موضوعیت لیے ہوئے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جن کو ائمہ سلف متشابہات کی قبیل سے قرار دیتے ہوں، وہ چند اہل علم کے نزدیک متشابہ نہ ہوں اور ان کی تاویل و تعبیر کی کوئی نہ کوئی معتدل اور قابلِ توجہ صورت نکل آئے، جس سے آیت زیر بحث کا اجمال دور ہو جائے۔ غموض رفع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جائے، اور اس میں مضمر معنی نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔

مسئلہ ناسخ و منسوخ

مسئلہ نسخ بھی ان مسائل میں سے ہے جو اپنی روح کے اعتبار سے اگرچہ بہت سادہ ہے، مگر مستشرقین کی دسیسہ کاریوں نے اس کو خاصہ پیچیدہ اور مشکل بنا دیا ہے۔ صحابہ اور تابعین کے حلقوں میں یہ ایک جانا بوجھا موضوع تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کی اہمیت مسلمہ تھی۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے تو سرِ مجلس ایک واعظ سے پوچھ لیا کہ کیا تم ناسخ و منسوخ کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟ اس نے جب نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا:

هلكت واهلكت، کہ تم خود بھی ہلاک ہوئے اور تم نے سننے والوں کو بھی ہلاکت میں ڈالا۔

بڑے بڑے ائمہ نے تقریباً ہر دور میں اس پر داد تصنیف دی ہے، اور بتایا ہے کہ نسخ لغۃً کسے کہتے ہیں، اصطلاح میں نسخ کا اطلاق کن معنوں پر ہوتا ہے اور یہ کہ متقدمین اور متاخرین میں اس کے استعمال میں کیا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یا یہ کہ وہ کون آیات ہیں جو سابق ہیں اور وہ کون ہیں جو مسبوق کے معنی میں آتی ہیں۔ یعنی کون ناسخ ہیں اور کون منسوخ ہیں۔

زرکشی نے اس علم کو عظیم الشان قرار دیا ہے، کیونکہ اس علم سے آشنا ہوئے بغیر کوئی شخص مسائل و احکام کے بارے میں دو ٹوک رائے قائم نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں نے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے، ان میں اہم حضرات کے نام یہ ہیں:

(۱) قتادہ بن دعامہ، تابعی۔ المتوفی ۱۱۸ھ

(۲) ابو عبید القاسم بن سلام۔ المتوفی ۲۲۴ھ

(۳) ابو داؤد السجستانی، صاحب السنن۔ المتوفی ۲۷۵ھ

(۴) ابن العربی، صاحب کتاب احکام القرآن۔ المتوفی ۵۴۳ھ

(۵) ابن الجوزی۔ المتوفی ۵۹۷ھ

(۶) ابن الانباری، صاحب کتاب الوقف والابتداء۔ المتوفی ۳۲۸ھ

(۷) ڈاکٹر مصطفیٰ زید نے اس باب میں نہایت مفصل اور جامع کتاب لکھی ہے جس میں نسخ کے اثبات کے ساتھ ساتھ اس کے تمام متعلقات پر نہایت عمدہ گفتگو کی ہے۔

نظریہ نسخ کے پیچھے کون اصول اور پیمانہ کارفرما ہے۔ اس کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ فلسفۂ تغیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر ایک نظر ڈال لی جاتے۔

بات یہ ہے کہ کائنات کے ہر ظہور میں ارتقا و تغیر کا ہمہ گیر قانون جاری و ساری ہے۔ آسمان متحرک ہے، نجوم و کواکب کی ترکیب و ساخت میں تبدیلیاں ہوتی ہیں، زمین نہ صرف گردش میں ہے بلکہ اپنی موجودہ صورت میں لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد کہیں متشکل ہوئی ہے۔ یہی حال زندگی کا ہے۔ اس نے کیا کیا بھیس نہیں بدلے ہیں اور بقاء انفع کے اصول کے تحت وجود کا کیا کیا پیرہن اختیار نہیں کیا ہے۔ کائنات کی تخلیق و آفرینش اور تکمیل و اتمام کے مرحلوں میں تغیر، تبدیلی اور ارتقا کا عمل برابر کارفرما رہا ہے۔ حتیٰ کہ معاشرہ اور قانون بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں یہ کہ اسی قانون کا فیض ہے کہ آج تہذیب و تمدن انسانی نے عروج و کمال کی بلندیوں تک رسائی حاصل کی ہے تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ کیا مذاہب و شرائع بھی تغیر و تبدل کے اس ہمہ گیر قانون سے دوچار ہوتے ہیں۔ تاریخ اور ادیان کا ہر جاننے والا اس کا جواب اثبات میں دے گا۔ جب معاشرہ حرکت کناں ہے اور تاریخ کی ہر صبح تازہ اور نئے مسائل لے کر طلوع ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسائل اور قانون و تشریع کا ڈھانچہ جوں کا توں رہے اور اس میں حالات کے مطابق کوئی تبدیلی اور ردوبدل واقع نہ ہو۔

شریعت اور مذہب کے دائرے ہر دور میں پھیلتے اور وسعت پذیر ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ قانون اور تشریع کا جو سادہ اسلوب حضرتِ آدم کے زمانہ میں رائج تھا وہ نوح اور ابراہیم کے دور میں قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی طرح فقہ و احکام کا جو انداز حضرتِ موسیٰ کے زمانہ میں مقبول تھا، اس پر پال کے تصورِ مسیحیت نے خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ کیونکہ اس میں اب اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔

اس کے بعد اسلام آیا۔ اس نے مذہب و دین میں نئی روح پھونکی اور تاریخ و حالات کی تبدیلیوں نے جن جن غلط فہمیوں اور جن جن اضداد کو ابھار رکھا تھا ان کا نہایت کامیاب حل پیش کیا۔ دوسرے لفظوں میں اسلام مذاہب و شرائع کی تکمیل و اتمام کا وہ نقطۂ عروج ہے جہاں پہنچ کر تغیر و ارتقا کا عمل ایک معنی میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے قرآن حکیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب نہ کوئی کتاب نازل ہوگی اور نہ کوئی پیغمبر نئی شریعت لے کر مبعوث ہوگا۔ اس لیے تغیر و تبدل کی منطق جن مقاصد کی تکمیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خواہاں تھی با حسن وجہ ان کی تکمیل ہو چکی۔ لہٰذا اب الہیات فقہ یا اخلاقیات کا کوئی ایسا اشکال باقی ہیں رہا جس کو حل کرنے کے لیے قرآن حکیم میں مناسب ہدایت و رہنمائی کا اہتمام نہ کر دیا ہو۔

لیکن اس کے یہ معنی نہ سمجھ لیجیے گا کہ تاریخ نے اپنی روش بدل لی ہے اور انسانی معاشرے میں اب کوئی بدیلی رونما نہیں ہونے کی۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں تک دینی اور انسانی زندگی کے بارے میں صولی مسائل وعقائد کا تعلق ہے اسلام نے اس کی پوری پوری وضاحت کر دی ہے اور نسل انسانی کو روشنی ور ہدایت کی اتنی بڑی مقدار سے بہرہ مند کر دیا ہے کہ اس سے استفادہ کے بعد کسی بھی پیش آمدہ صورتِ ال سے اجتہاد اور فکر و تدبر کے ذریعے نمٹنا قطعی مشکل کام نہیں رہا۔

نسخ اور تغیر و ارتقا کے عمل کو اس وسیع تر مفہوم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجیے تو یہ حقیقت کھل کر فکر و نظر کے سامنے آجائے گی کہ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اس عمل سے اللہ تعالیٰ کے ہمہ گیر علم کی فی ہوتی ہے بلکہ اس سے الٹا یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ذات گرامی علم و ادراک کی اس وسیع تر نوعیت سے صاف پذیر ہے کہ مستقبل کا کوئی گوشہ اس سے اوجھل نہیں۔ وہ ازل سے اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ریخ بہر حال اپنا عمل جاری رکھے گی اور معاشرہ تغیر و تبدل کا ہدف بنتا رہے گا اس لیے ضروری ہے کہ شرائع ر ادیان کا ڈھانچہ ان تقاضوں کو قبول کرتا رہے تا آنکہ تغیر و تبدل کا یہ ہمہ گیر اور تخلیقی عمل اپنی غرض وغایت و پالے اور ایک آخری قانون اور آخری شریعت کی صورت میں جلوہ گر ہو جائے، جو ہر لحاظ سے مکمل ر جامع ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم ہے کہ معاشرہ یا تاریخ کے کس مرحلے میں کن ہدایات احکام سے نوع انسانی کو نوازنا ہے۔ احکام کا تعلق صرف علم الٰہی سے نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ ے اسلوب تربیت سے ہے اور اس حقیقت سے ہے کہ اقوام و ملل کو کیونکر بلند تر اخلاق اور روحانی نصب العین ے حصول کے لیے تیار کرتا ہے، اور کس طرح آہستہ آہستہ اور بتدریج تہذیب و اخلاق کی اس منزل تک تا ہے جو انسانیت کے ارتقا کی آخری منزل ہے۔

اس مرحلے میں قدرتاً یہ سوال ابھرتا ہے کہ گزشتہ ادیان کے بارے میں تو بلا شبہ تاریخ کے اس منطقی عمل کی رغرمانی سمجھ میں آتی ہے۔ دریافت طلب یہ نکتہ ہے کہ آیا تئیس سال کے اس طویل عرصے میں جو مکی اور مدنی ندگی کے دو مختلف خانوں میں انقسام پذیر ہے جس میں کہ قرآنِ حکیم نازل ہوتا رہا اور قوم کے حالات اور نفسیات ے مطابق رشد و ہدایت کی کرنیں بکھیرتا رہا۔ کچھ مرحلے ایسے بھی آتے ہیں جہاں نسخ و تغیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر تاریخ کا یہ عمل ہمہ گیر ہے اور معاشرہ کبھی بھی ساکن و جامد نہیں رہا تو ایسے مرحلے تئیس سال کی اس مدت میں آنے چاہئیں، بالخصوص نسخ و تغیر کا مسئلہ اس وقت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے جب اسلام کے بارے میں ہمارا جانا بوجھا عقیدہ یہ ہو کہ یہ بے جان اور ٹھس مذہب ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ ایسا زندہ اور متحرک دین ہے جس نے رشد و ہدایت کے اسلوب میں زمان و مکان کے اختلاف کو ہمیشہ ملحوظ و مرعی رکھا ہے۔

لطف یہ ہے کہ تاریخ کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اسلامی علوم و فنون کی تاریخ پر غور کیا ہے وہ بھی اس بات کی تائید کریں گے کہ تیسری صدی ہجری تک جمہور محدثین، فقہا اور اہلِ علم کا یہ مسلک رہا ہے کہ قرآنِ حکیم میں بلاشبہ کچھ آیتیں ناسخ ہیں اور کچھ منسوخ پائی جاتی ہیں۔ ابومسلم اصفہانی وہ پہلا شخص ہے جس نے قرآنِ حکیم میں وقوعِ نسخ کا انکار کیا۔ اس کے بعد دو واضح گروہ بن گئے۔ ایک گروہ نے جس میں فقہ و حدیث کے ماہرین شامل ہیں قرآنِ حکیم میں وقوعِ نسخ کی تائید کی اور دوسرے گروہ نے جو عقلیت پسند حضرات کی ترجمانی کرتا ہے اس کا انکار کیا۔ بحیثیت مجموعی اثباتِ نسخ کے موضوع پر اتنا کچھ لکھا گیا کہ بقول علامہ سیوطی کے اس کا حد و شمار میں آنا مشکل ہے۔

مختصر لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ عالمِ اسلامی کا کوئی اہم مرکز ایسا نہیں ملتا اور تیرہ سو سال کی گزشتہ طویل تاریخ میں کوئی صدی ایسی پائی نہیں جاتی جس میں اس مسئلے پر اظہارِ خیال نہ کیا گیا ہو۔ اس موضوع سے متعلق پہلے ہی قدم پر چند نکات کا ذہن میں رہنا ضروری ہے:

(۱) اس مسئلے کے بارے میں عہدِ نبوی ہی میں غور و خوض کا آغاز ہو گیا تھا۔ چنانچہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی مجالس میں برابر متعلقہ آیات کی تفسیر، تاویل اور دائرۂ اطلاق سے متعلق بحثیں ملتی ہیں۔

(۲) قرنِ اول کے بعد فقہا اور مستند رواۃ کی خاصی بڑی تعداد نے ان آثار کی تنقیح اور تلاش کا کام شروع کر دیا تھا جن سے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے کہ احکام و مسائل کے اعتبار سے کون آیات سابق ہیں اور کون لاحق و ناسخ۔

(۳) دوسری صدی ہجری میں حفاظِ حدیث کے ایک طبقے نے ناسخ و منسوخ کے مسئلے سے متعلق تصنیف و تالیف کی طرح ڈال دی تھی اور تیرھویں صدی کے آخر تک یہ سلسلہ جاری رہا جس میں حجاز، شام، عراق، خراسان، مصر، مغرب اور بلادِ اندلس کے علما نے حصہ لیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) اس بحث میں حصہ لینے والوں میں قریب قریب تمام مدرسۂ فکر کے ائمہ کا نام نامی ملتا ہے چنانچہ امام ابوحنیفہ، شافعی، مالک اور امام احمد بن حنبل کے تلامذہ کے علاوہ معتزلہ نے بھی اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ یہی نہیں فنون کے اعتبار سے محدثین اور فقہا کے علاوہ اصول نحو اور ادب کے جاننے والوں نے بھی اس بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔

نسخ آیات کا اطلاق کب اور کن شرائط کے تحت ہوتا ہے؟ اصول تاویل کے نقطۂ نگاہ سے یہ سوال بہت اہم ہے۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ دو آیتوں میں اس طرح کا اختلاف نظر آتا ہو جس کو تسلی بخش طریق سے حل نہ کیا جا سکے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک زمانے کے اعتبار سے سابق ہو اور دوسری لاحق و ناسخ ہو۔ آخری شرط یہ ہے کہ معنی و اطلاق کا یہ اختلاف صحابہ میں معروف ہو اور بہ سند صحیح ہم تک پہنچا ہو۔

ان شرائط کو ملحوظ نہ رکھنے سے افراط و تفریط کا عمل دخل ہوا۔ یعنی ایک طرف دعویٰ کیا گیا کہ قرآنِ حکیم سرے سے نسخ کے مفہوم سے آشنا ہی نہیں ہوا، اور دوسری طرف نسخ کے دائرے کو پانچ صد آیات تک وسیع کر دیا گیا۔ جن لوگوں نے افراط سے کام لیا انھوں نے تعمیم و تخصیص، اجمال و تشریح اور زمانی تقدم و تاخر کے ادنیٰ اختلاف کو تناقض قرار دے کر اس پر نسخ کا فتویٰ لگا دیا۔ جو لوگ تفریط کے مرتکب ہوئے انھوں نے اس سلسلے میں احادیث و آثار اور اسلامی تاریخ میں تغیر و تاویل کے تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیا۔ اس باب میں متوازن رائے یہ ہے کہ جن آیات میں نسخ واقع ہوا، ان کی تعداد نو، دس، یا پانچ یا پانچ اور چھ سے زیادہ نہیں۔ باقی تمام آیات جن کو منسوخ سمجھا جاتا ہے، وہ قطعی منسوخ نہیں۔

اصولِ تشریع کے اعتبار سے بنیادی نقطہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے زیادہ تر اپنی تعلیمات کی اساس و نمو، استحکام اور استواری پر رکھی ہے، اور کہیں کہیں اگر نسخ واقع ہوا ہے تو اس بنا پر کہ انسانی معاشرے میں تبدیلیوں کی وجہ سے خلا نہ پیدا ہونے پائے۔ اس لیے ایسے احکام و مسائل سے اس کو بہرحال بہرہ مند رکھا جائے جو اس مرحلے میں ترتیب کے نقطۂ نگاہ سے ضروری ہوں۔ اور یہ بات قرآنِ حکیم ہی کے ساتھ خاص نہیں، ہر وہ قانون اور دستور جو معقول اور متحرک ہو اس میں سابق و لاحق نوع کے احکام و تصریحات کا ہونا لازمی ہے۔

© rasailojaraid.com